POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 March 2024, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 85 واں سال

انجمن ترقی اردو (ہند)

Date of Publication: 09-03-2024 • Price: 5/- • 15-21 March 2024 • Issue: 11 • Vol:83

۱۵ تا ۲۱ مارچ ۲۰۲۴ء • شمارہ ۱۱ • جلد ۸۳

صحتِ زبان (۱۳)

رؤف پاریکھ

☆میرا صاحب زادہ یعنی؟

عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب ایک بار اپنے بیٹے کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ کسی نے پوچھا "یہ آپ کا صاحب زادہ ہے؟" کہنے لگے "نہیں جناب، صاحب زادہ نہیں ہے۔ میرا بیٹا ہے"۔ دراصل شاہ جی لفظ 'صاحب' کو انگریزوں کے مفہوم میں برتتے تھے۔

کچھ لوگ اپنے بیٹے یا بیٹی کا تعارف کراتے ہیں تو "گاڑھی اردو" بولنے کے شوق میں کہتے ہیں کہ یہ میری صاحب زادی ہیں یا یہ میرے صاحب زادے ہیں۔ ان کے خیال میں اس سے مخاطب پر رعب پڑتا ہے کہ انھیں بہت ثقیل اردو بھی آتی ہے۔ لیکن درحقیقت کوئی صاحب جب اپنی اولاد کو صاحب زادہ یا صاحب زادی کہتے ہیں تو گویا اپنی اردو دانی کے بارے میں شبہات پیدا کر دیتے ہیں کیوں کہ صاحب کا ایک مفہوم ہے مالک یا آقا اور صاحب زادہ کا مطلب ہے صاحب کا بیٹا، صاحب کی اولاد۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ وہ حضرت خود کو صاحب کہہ رہے ہیں۔ یہ بڑی بے ہودہ بات ہے۔ دوسرے معنی یہ ہوتے ہیں کیوں کہ اپنی اولاد کو صاحب کی یا کسی کی اولاد کہنا بھی بہت بے ہودہ بات ہے۔

شاہ صاحب تو خیر اس معاملے میں بہت سخت تھے لیکن بہرحال دوسروں کی اولاد کو "آپ کا صاحب زادہ" یا "آپ کی صاحب زادی" کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس سے مخاطب کے لیے احترام جھلکتا ہے (یعنی آپ احتراماً انھیں صاحب کہہ رہے ہیں)۔ البتہ اپنی اولاد کو صاحب زادہ کہنا گویا خود اپنا احترام کرنا ہے، واہ صاحب! کیا بات ہے!

☆بعد ادب نہیں بصد ادب

پس منظر کو پس منظر اور پیش لفظ کو پیش لفظ بول کر ہماری جان جلانے والی تو خیر ایک طالبہ تھی اور بقول ہمارے ایک دوست کے ان طالب علموں کو اردو کے سات خون معاف ہیں لہٰذا جانے دیجیے۔ لیکن جب اردو کے ایک پروفیسر صاحب کو "بعد ادب" بولتے سنا تو نہ پوچھیے کیسا جی جلا (اور اردو کی حالت زار کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی)۔ پس منظر اور پیش لفظ کی طرح یہاں بھی اضافت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہاں 'ب' کا مطلب ہے 'سے'۔ بصد ادب یعنی سو (۱۰۰) ادب سے، مراد یہ کہ بہت ادب سے۔

ان پروفیسر صاحب سے تو کچھ کہنا سوے ادب ہوگا لیکن آپ سے بصد ادب درخواست ہے کہ اسے بصد ادب (یعنی کسرۂ اضافت کے بغیر) بولا کیجیے کیوں کہ یہ اضافت کے بغیر ہی درست ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو لوگ اردو پڑھاتے ہیں ان کو اردو کا ایک خون بھی معاف نہیں ہے۔

☆گزیدہ یا گزیدہ؟

فارسی میں ایک مصدر ہے گزیدن یعنی کاف پر پیش کے ساتھ۔ معنی ہیں: چننا، منتخب کرنا، اختیار کرنا، نیز (کسی کو کسی پر) ترجیح دینا۔ اسی مفہوم میں فارسی میں برگزیدن بھی آتا ہے۔ چناں چہ گزیدہ کا مطلب ہوا منتخب، چنا ہوا اور جس کا انتخاب کیا گیا ہو۔ اردو میں عام طور پر نیک لوگوں اور بزرگانِ دین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ (یعنی منتخب) بندے ہیں۔ اسی سے برگزیدگی کا لفظ بھی بنا ہے یعنی برگزیدہ ہونے کی حالت یا کیفیت۔

فارسی میں ایک اور مصدر ہے گزیدن یعنی کاف پر زبر کے ساتھ۔ اس کا مطلب ہے کاٹنا، ڈنک مارنا (کسی جانور یا کیڑے یا سانپ وغیرہ کا) کاٹنا۔ لہٰذا گزیدہ (کاف پر زبر) یعنی ڈسا ہوا ہے۔ اسی سے سگ گزیدہ (جسے کتے نے کاٹا ہو) اور مار گزیدہ (جسے سانپ نے ڈسا ہو) جیسے مرکبات بنے ہیں۔ طالب علموں کے لیے عرض ہے کہ مار گزیدہ میں یہ 'مار' اردو کی مار نہیں ہے بلکہ فارسی کا مار ہے۔ فارسی میں سانپ کو مار کہتے ہیں۔ اور سگ یعنی کتا۔ اسی طرح ایک ترکیب غالب نے بنائی "مردم گزیدہ" یعنی جسے انسانوں نے ڈسا ہو۔ گویا وہ شخص جسے لوگوں سے بہت آزار پہنچا ہو۔ غالب نے کہا کہ:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

غالب کا کہنا ہے کہ میں آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر بھی ڈر جاتا ہوں کیوں کہ انسانوں سے ڈرتا ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ جسے کتے نے کاٹ لیا ہو وہ پانی سے خوف کھاتا ہے۔ انگریزی میں اس مرض کو ہائیڈروفوبیا (hydrophobia) اور فارسی میں آب ترسی کہتے ہیں (دراصل فارسی میں ترسیدن کا مطلب ہے ڈرنا اور اسی سے خدا ترس یعنی خدا سے ڈرنے والا اور خدا ترسی یعنی خدا سے ڈرنے کی حالت جیسی تراکیب بنی ہیں)۔ آب ترسی کو اردو میں ہڑک (پہلے حرف پر پیش اور واو مجہول) بھی کہا جاتا ہے۔ کتے سے کٹوانے کی کیفیت یا حالت کو سگ گزیدگی کہتے ہیں۔ لیکن غالب تو انسانوں کے ڈسے ہوئے تھے لہٰذا انھوں نے خود کو مردم گزیدہ کہا۔ مردم یعنی آدمی، انسان۔ یہ وہی مردم ہے جو مردم شماری کی ترکیب میں بھی ہے یعنی census۔ اہل علم سے معذرت، لیکن کیا کریں صاحب اب نئی نسل کو ہر اردو اور فارسی لفظ کا انگریزی میں ترجمہ کر کے بتانا پڑتا ہے (اور اردو کو بچانا ہے تو اس نئی نسل کو "گھیرنا" پڑے گا)۔

☆سعودیہ کسی ملک کا نام نہیں ہے

چند روز قبل ایک اخبار میں سعودی عرب نامی ملک کو "سعودیہ" لکھا ہوا دیکھا۔ تعجب ہوا کہ کسی ملک کا نام کوئی اپنی مرضی سے کیسے تبدیل کر سکتا ہے؟ لیکن اس اخبار والوں کو کون بتائے کہ سعودیہ کسی ملک کا نام نہیں ہے بلکہ یہ سعودی عرب کی فضائی کمپنی کا نام ہوا کرتا تھا (اسے سعودیہ کہتے تھے)۔ یہ نام بھی اب تبدیل ہو گیا ہے اور اسے سعودی عریبین ایئرلائنز کر دیا گیا ہے۔ سعودی عرب کو سعودیہ کہنے کی کوئی تک نہیں ہے۔ عام لوگ عام بول چال میں سعودی

عرب کو سعودیہ کہہ دیتے ہیں لیکن اسے سند نہیں مانا جا سکتا۔ کم از کم اخبارات کو اس عوامی استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔

سعودی عرب کے نام کے سلسلے میں دوسری بار حیرت اس وقت ہوئی جب ایک ٹی وی چینل پر ایک خاتون میزبان کو "سعودی" (س مو دی) کا تلفظ "سَودی" کرتے سنا۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ بظاہر پڑھی لکھی نظر آنے والی یہ خاتون "سودی عرب" کس کو کہہ رہی ہیں لیکن پھر سمجھ میں آیا کہ انگریزی کے ہجے Saudi میں "ایس اے یو" کو ملا کر "سو" پڑھ رہی ہیں کیوں کہ زندگی بھر اردو یا عربی حروف میں کبھی سعودی لکھا ہوا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ اتنی خوش قسمت تھیں کہ کسی کو سعودی عرب بولتے ہوئے سن سکیں۔ اور یہ بھی سمجھ میں آیا کہ اردو کے ٹی وی چینلوں پر ملازمت کے حصول کے لیے اردو جاننے کی شرط اب ختم کر دی گئی ہے۔ افسوس!

☆ شاہزادی، شہ زادی یا شہزادی؟

ایک نوجوان نے برقی ڈاک کے ذریعے یہ سوال پوچھا ہے: اردو میں کچھ الفاظ دو طرح لکھے جاتے ہیں، مثلاً شاہنشاہ اور شہنشاہ، شاہزادی اور شہزادی۔ اسی طرح پناہ گاہ کو پنہ گاہ بھی لکھا جاتا ہے۔ ان میں سے کون سا املا درست ہے؟

جواب یہ ہے کہ محمد حسین آزاد نے فارسی قواعد پر ایک کتاب اردو میں لکھی ہے جو نایاب ہے۔ اس کا نام ہے جامع القواعد۔ پہلی بار 1889 میں لاہور سے چھپی اور نصاب میں شامل کر لی گئی (ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے اس کے پہلے ایڈیشن کا سال اشاعت 1884 لکھا ہے جو غالباً سہو کاتب ہے)۔ یہ کتاب اب کم یاب بلکہ تقریباً نایاب ہے حالاں کہ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں (کاش کوئی دوبارہ چھاپ دے)۔ راقم کے ذاتی ذخیرے میں اس کے تیرھویں ایڈیشن (1907) کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس میں آزاد نے فارسی زبان کی بعض خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فارسی کے بعض الفاظ کے املا میں سے الف کو کبھی کبھی حذف کر دیا جاتا ہے اور مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ الف کو حذف کرنے کا یہ عمل کبھی لفظ کے شروع میں ہوتا ہے اور کبھی درمیان میں۔ ان کی مثالیں بعض دیگر کتب میں بھی ہیں جن کو یہاں مختصراً پیش کیا جا رہا ہے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ الف کو حذف کرنے کا یہ عمل زیادہ تر شاعری میں ہوتا ہے اور نثر میں ایسی مثالیں ذرا کم ہی ملتی ہیں۔

الف کو لفظ کی ابتدا میں حذف کرنے کی مثال اگر دیکھیں تو افسانہ کو فسانہ بھی لکھا اور بولا جاتا ہے جس کی ابتدا میں الف کے بغیر وہی معنی رہتے ہیں۔ اسی طرح اشتر کی بجائے شتر (یعنی اونٹ) آتا ہے۔ ایسی اور مثالیں بھی ہیں، جیسے اسکندر سے سکندر، اشکم سے شکم (یعنی پیٹ)، اشکار سے شکار (یعنی شکار) بنا لیا گیا ہے۔ افسون یا افسوں (یعنی جادو یا فریب) کو فسون یا فسوں بھی لکھا جاتا ہے (یعنی نون کے ساتھ یا نون غنے کے ساتھ)۔ مثلاً غالب کا مصرع ہے:

ع مجنوں فسون شعلہ خوانی مانگے ہے

اس مصرعے میں فسانہ اور فسوں دونوں کی مثال آ گئی ہے۔ احمد فراز کا شعر ہے:

اس کا اپنا ہی کرشمہ ہے فسوں ہے یوں ہے
یوں تو کہنے کو سبھی کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے

اسی طرح ابراہیم کے بجائے براہیم۔ اقبال کا مصرع دیکھیے:

ع یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

افسردہ کے بجائے فسردہ اور افسردگی کی بجائے فسردگی۔ فیض نے کہا ہے:

فضائے دل پر اداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے

لفظ کی ابتدا میں الف کو حذف کرنے کی ایک مثال استادہ کو ستادہ لکھنا بھی ہے۔ مثلاً احمد فراز نے کہا کہ:

جیسے کوئی در دل پر ہو ستادہ کب سے
ایک سایہ نہ دروں ہے نہ بروں ہے یوں ہے

فارسی الفاظ میں کبھی درمیان کا الف بھی حذف کر دیتے ہیں مثلاً پیراہن سے پیرہن (یعنی قمیص)، داماں سے دامن، دہان سے دہن، پناہ سے پنہ اور گاہ سے گہ، جیسے کارگاہ (یعنی ورکشاپ یا کارخانہ) کے بجائے کارگہ۔ میر کا شعر ہے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

اسی طرح نگاہ کو "نگہ" بھی لکھا جاتا ہے، مثلاً غالب کہتے ہیں:

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

یہاں اگر دوسرے مصرعے میں نگہ کی بجائے نگاہ یا نگاہ کی بجائے نگہ رکھ دیا جائے تو مصرع ساقط الوزن ہو جائے گا۔ لفظ نگہ پر استاد ابراہیم ذوق کا شعر یاد آ گیا:

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

اسی لفظ نگہ سے نگہ بان اور نگہ بانی کی تراکیب ہیں جنھیں ملا کر نگہبان اور نگہبانی لکھا جاتا ہے۔ تھوڑا سا مسئلہ بظاہر اس وقت نظر آتا ہے جب بعض الفاظ و مرکبات میں سے الف کو حذف کرنے کے بعد انھیں ملا کر لکھا جاتا ہے اور اس طرح اس کا تلفظ یا مرکب املا توڑ کر لکھے ہوئے الفاظ و مرکبات سے بظاہر ذرا سا مختلف ہو جاتا ہے، جیسے: گناہ سے گنہ۔ غالب نے کہا ہے:

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

یہاں اگر گنہ کو گناہ پڑھا یا لکھا جائے تو مصرع بحر سے خارج ہو جائے۔ اسی طرح الف کو نکال کر گناہ گار کی بجائے گنہ گار لکھتے ہیں اور اسے ملا کر گنہگار لکھا جاتا ہے۔

اس طرح کی چند اور مثالیں دیکھیے: ماہ یعنی چاند کے بجائے مہ اور ماہتاب کے بجائے مہ تاب (مہتاب)۔ شاہ سے شہ (یعنی بادشاہ) اور شاہ زادہ (بادشاہ کی اولاد) کے بجائے شہ زادہ (شہزادہ)۔ راہ (یعنی راستہ) کے بجائے رہ اور راہ گزر (راہگزر) کی بجائے رہ گزر (رہگزر)۔

بقول افتخار عارف:

ہوا بھی ہو گئی میثاق تیرگی میں شریک
کوئی چراغ اب رہ گزر میں رکھا جائے

اسی طرح سیاہ سے سیہ (جیسے سیہ بختی یعنی بد نصیبی)، سپاہ (یعنی فوج اور اسی سے بنا ہے سپاہی) کے بجائے سپہ اور سپہ سالار۔

اب اس کی روشنی میں دیکھیں تو شاہ زادی میں سے پہلا الف حذف کیا گیا تو شہ زادی بنا اور اسے ملا کر لکھا تو شہزادی۔ اسی طرح شاہ زادہ کو شہ زادہ اور ملا کر شہزادہ لکھا جاتا ہے۔ شہنشاہ دراصل اضافت مقلوب کی ایک مثال ہے۔ اصل میں یہ ترکیب تھی شاہِ شاہان (یعنی بادشاہوں کا بادشاہ) اور فارسی میں ترکیب مقلوب ہوتی ہے تو اس میں مضاف اور مضاف الیہ کی جگہ بدل جاتی ہے اور اضافت نکل جاتی ہے۔ شاہنشاہ میں بھی یہی صورت ہے کہ شاہِ شاہان الٹ کر شاہان شاہ (بغیر اضافت کے) بنا۔ یعنی ملا کر لکھا جائے تو شاہنشاہ۔ اور پھر شاہنشاہ سے شہنشاہ ہو گیا۔ مطلب وہی رہا یعنی شاہوں کا شاہ۔ گویا شاہزادہ و شہزادہ بھی درست ہے اور شاہزادی و شہزادی بھی۔ البتہ ان کا ملا ہوا املا یعنی شہزادہ و شہزادی زیادہ رائج ہے۔ اسی طرح اب شہنشاہ رائج ہے۔

☆ گُزیں یا گَزیں؟

اوپر گزیدن اور گزیدن کا ذکر آیا۔ گزیدن (یعنی انتخاب کرنا) سے لاحقہ فاعلی بنا گُزیں (کاف پر پیش) جس کا مفہوم ہے: منتخب کرنے والا، وہ جو انتخاب کرے، چننے والا۔ اسی لاحقے سے پناہ گزیں کی ترکیب بنی۔ لفظی معنی ہیں جو پناہ لینے کا انتخاب کرے، مراد ہے پناہ لینے والا، جو پناہ لے۔ یہی لاحقہ یعنی گزیں ہمیں عزلت گزیں اور خلوت گزیں[5] کی ترکیب میں نظر آتا ہے۔ عزلت کے معنی بھی وہی ہیں جو خلوت کے ہیں، یعنی تنہائی۔ جو گوشہ نشیں ہو جائے اسے گوشہ گزیں بھی کہتے ہیں۔

لیکن گَزیں (کاف پر زبر) گزیدن (یعنی ڈسنا) سے بنا ہے اور اسٹین گاس کی لغت کے مطابق گزیں کے معنی ہیں ڈسنے والا یعنی (جانور یا کیڑا) جو ڈسے۔ ایک پودا ہوتا ہے جس کے پتے کٹیلے اور خاردار ہوتے ہیں، اپنا نام تو نہیں ہے مگر دانتوں جیسے پتوں کی وجہ سے اس کو فارسی میں گزیں (یعنی ڈسنے والا) کہتے ہیں۔ فارسی میں اس کا ایک اور نام گزنہ بھی ہے۔ اردو میں اس پودے کا نام بچھوا ہے اور اسے بچھو بوٹی بھی کہا جاتا ہے۔ اسے انگریزی میں stinging nettle کہتے ہیں۔[7] جو جانور یا کیڑا ڈس لے یا کاٹ لے اسے گزندہ (کاف پر زبر اور زے کے نیچے زیر) کہتے ہیں۔

حواشی:

1 وحید الدین سلیم، وضع اصطلاحات (کراچی: انجمن ترقی اردو، 1965)، ص 132 (اشاعت پنجم)۔

2 A Comprehensive Persian-English Dictionary (مرتبہ ایف اسٹین گاس F Steingass) (لاہور: سنگ میل، 2000، عکسی طباعت، اشاعت اول 1892)۔

3 ایضاً۔

4 ایضاً۔

5 عبدالستار صدیقی، مقالات صدیقی (مرتبہ مسلم صدیقی) (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکیڈمی، 1983)، ص 145۔

6 وحید الدین سلیم، وضع اصطلاحات محولۂ بالا

7 Dictionary of Urdu, Classical Hindi and English مرتبہ جان ٹی پلیٹس (John T. Platts)، (لندن: کراسبی لاک ووڈ اینڈ سنز، 1911) (اشاعت اول 1884)۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ
سابق پروفیسر شعبۂ اردو، جامعہ کراچی
drraufparekh@yahoo.com

عزیزِ بھوپال، عزیز قریشی کی جرأت و بانکپن مثالی رہی ہے

عارف عزیز

کئی چہروں والے دیومالائی کرداروں کی طرح، انسانوں کے بھی ایک سے زیادہ چہرے اور کردار ہوا کرتے ہیں۔ متضاد چہرے رکھنا جہاں انسانی کمزوری پر محمول کیا جاتا ہے، وہیں متنوع صلاحیتوں کا مالک ہونا، انسانی شخصیت کی خوبی تصور کی جاتی ہے۔ عزیز گرامی ڈاکٹر عزیز قریشی صاحب کا میں آخرالذکر انسانوں میں شمار کرتا ہوں کیوں کہ ایک طرف میدان سیاست میں اُن کے کارنامے روشن حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں تو دوسری طرف اُن کی ملت پرستی کسی دلیل و شہادت کی محتاج نہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے وہ عام سیاست دانوں کے مقابلے میں اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتے تھے۔ آج جب اُن کی سیاسی و سماجی زندگی پانچ دہائیوں کو عبور کر چکی تھی تو یہ سچ پہلے سے زیادہ واضح ہو گیا ہے، ممبر اسمبلی، ریاستی وزیر، رکن پارلیمان، کانگریس تنظیم کے عہدیدار، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین، اردو اکادمی مدھیہ پردیش کے صدر، سابق اتراکھنڈ اور اترپردیش کے گورنر، یہ اُن کی سیاسی زندگی کے وہ پڑاؤ ہیں جس میں وہ اپنی متنوع شخصیت کے گہرے نقوش مرتسم کر چکے تھے۔ ان سبھی کرداروں کو نبھاتے ہوئے میں نے فضیلت مآب عزیز قریشی کو دیکھا ہے اور مجھے جو خوبی نظر آئی اس نے گہرے طور پر متاثر بھی کیا ہے۔ مشہور صحافی حکیم سید قمرالحسن صاحب مرحوم نے انھیں "عزیز بھوپال" کا خطاب دیا تھا، خوشونت سنگھ کو وہ مسلمانوں کے حقیقی بہی خواہ نظر آئے، پروفیسر اے ایم خسرو اُن کی صلاحیتوں کے معترف تھے، ارجن سنگھ نے اپنا معتمد بنایا تو دگ وجے سنگھ نے انھیں اپنا بڑا بھائی مانا۔

کہتے ہیں کہ بڑے لوگوں کی نسبت سے انسان بڑا بن جاتا ہے لیکن جو بڑوں سے تعلق کا استحقاق پیدا کرے وہی اُن کی نظر میں جگہ پاتا ہے، فخرالدین علی احمد ہوں یا ڈاکٹر شنکر دیال شرما، اندرا گاندھی ہوں یا چندر پرکاش سیٹھی، ان سبھی دانشور شخصیتوں کی سرپرستی عزیز قریشی کو میسر آئی، خود اُن کے باصلاحیت ہونے کی نشانی ہے۔ عزیز قریشی کی جس دوسری خوبی نے میری نظر میں اُن کی توقیر بڑھائی، وہ ملک و قوم کے ساتھ ملت کے لیے کچھ کرنے کا خاصا جذبہ تھا، جس کو بروئے کار لاکر انھوں نے بعض ایسے کام کیے جو ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ خاص طور پر انھوں نے پہلی جلاوطن سرکار کے وزیراعظم اور فرزند بھوپال پروفیسر مولانا برکت اللہ بھوپالی سے نئی نسل کو متعارف کرایا۔ سب سے پہلے ایم عرفان مرحوم نے اُن پر کتاب لکھی لیکن آج کی نئی پیڑھی کا اس محب وطن سے رشتہ قائم کرنے کا کام جس نے انجام دیا وہ محترم عزیز قریشی تھے، موصوف کی پُرزور تحریک اور اس وقت کے وزیراعلیٰ ارجن سنگھ کی حمایت سے بھوپال میں منعقد ہونے والے کانگریس کے ریجنل اجلاس کے لیے بسائے جانے والے نگر کا نام برکت اللہ نگر رکھا گیا۔

اس کی پاداش میں عزیز قریشی کو کانگریس کے ہی ایک حلقے کے عتاب کا شکار بننا پڑا جو چاہتا تھا کہ برکت اللہ بھوپالی کے بجائے، روی شنکر شکل کے نام سے مذکورہ اجلاس گاہ کو منسوب کیا جائے۔ بہرحال اُن کی پہل سے نئی نسل کو یہ جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا کہ ملک و قوم کے تئیں مولانا برکت اللہ بھوپالی کی شخصیت و خدمات کیا ہیں؟ کوئی سات سال بعد اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے تشکیل دی گئی ایک کمیٹی کی سفارشات میں انھوں نے بحیثیت کمیٹی صدر بھوپال یونیورسٹی کا نام برکت اللہ یونیورسٹی رکھنے کی پُرزور سفارش کی۔ مجھے یاد ہے 15 اگست 1988 کو جب وزیراعلیٰ ارجن سنگھ نے اس فیصلے کا اعلان کیا تو برکت اللہ بھوپالی کا نام عوام کے ذہن میں از سرنو تازہ ہو گیا۔ بعد میں ارجن سنگھ نے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل کا عہدہ سنبھالا تو عزیز قریشی صاحب کے سپرد پھر کئی کام کیے، انھیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا وائس چیئرمین بنایا، اُن کی سفارش پر کونسل کے دائرہ کار میں اضافہ کیا، اس کے بجٹ کو کئی گنا بڑھا دیا، یو این آئی کی اردو خبر رساں سروس لینے کے لیے اردو روزناموں کو سبسڈی فراہم کرنے کی منظوری دی، اسی زمانے میں "عزیز قریشی کمیٹی" نے ملک میں ایک اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی سفارش کی تو اس کو بھی عملی جامہ پہنانے کی کارروائی آگے بڑھی اور آج حیدرآباد میں یہ یونیورسٹی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نام سے نئی نسل کو اردو کی تعلیم سے آراستہ کرنے کا اہم کام انجام دے رہی ہے۔

گرامی قدر عزیز قریشی کے یہی کام دو دہوں کی طویل سیاسی زندگی پر بھاری ہیں لیکن انھوں نے اپنی لیاقت سے اس کے علاوہ اور بھی کئی کام کیے۔ یہاں میں خصوصیت سے جس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ ہے ایشیا کی مایۂ ناز مسجد تاج المساجد سے متعلق آراضی کے قضیے کو سلجھانا ہے۔ اُن کی گہری دلچسپی سے وزیراعلیٰ چندر پرکاش سیٹھی نے تاج المساجد کی دو دکانوں کو تعمیر کرنے کی اجازت دی، بعد میں ارجن سنگھ سے بھی انھوں نے اراضی کا ایک حصہ تاج المساجد کو دلایا، جس پر دوکانوں کے علاوہ شاندار لائبریری کی عمارت آج تعمیر ہو چکی ہے۔ ان کاموں کی اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب شرپسندوں نے اس علاقے میں دراندازی کی کوشش کی۔ امیر دارالعلوم تاج المساجد مولانا عمران خاں صاحب ندوی ازہری نے اس کو وقتی طور پر اپنے مکتوب میں جن الفاظ کے ذریعے تشکر و امتنان کا اظہار کیا، وہ کسی بھی عوامی رہنما کے لیے باعث فخر ہو سکتا ہے۔

بھوپال میں "اقبال ادبی مرکز" کا قیام ہوا اور وہ کے باوقار اعزاز "اقبال سمان" کا اجرا ہو یا "اقبال میدان" کی تعمیر، اس میں عاشق اقبال ممنون حسن خاں صاحب کے تصورات و خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت و انتظامیہ کے گلیاروں سے منظوری دلانے کے کام میں قریشی صاحب ہی پیش پیش رہے ہیں۔ اُن کی شخصیت جن عناصر سے مل کر تشکیل پائی۔ اس میں تمدن، تہذیب اور شائستگی کے ساتھ اُن کی قوت ارادی کا بڑا دخل تھا، وہ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگانا پسند نہیں کرتے حالاں کہ اردو، عربی، انگریزی کے ساتھ سوشل سائنس کے بھی وہ اسکالر تھے۔ مختلف علوم پر اُن کی جو گہری نظر تھی، اس کی ترجمانی اکثر اُن کی تحریر و تقریر میں ہوتی تھی جس کے اظہار میں وہ کسی مصلحت و منافقت سے کام نہیں لیتے بلکہ جو حق سمجھتے اس کو برملا بیان کر دیتے۔ علامہ اقبال پر بھارت بھون میں منعقدہ ایک سیمینار میں، میں نے انھیں شاعر مشرق اقبالؔ کے تعلق سے ترقی پسندوں کے ذہنی تضاد پر حملہ آور ہوتے اور جواب میں سردار جعفری جیسے جہاں دیدہ ترقی پسند کو معذرت خواہانہ رویہ اپناتے دیکھا ہے۔

"خطے کے بندوں کو آتی نہیں روباہی" کے مصداق ایسی وہ خوبیاں ہیں، جنھوں نے عزیز قریشی کو عزیز جنتہ بنا دیا۔ جب وہ اتراکھنڈ کے گورنر تھے تو انھیں شکتی وہ تنظیمی اختلافات میں الجھایا جاتا اور دینی فکر و نظر کے جرأت مندانہ مظاہرے سے وہ ایک جہاں کو معترف بناتے رہے، اسی جرأت و بانکپن کے اعتراف میں انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بجا طور پر ڈی لٹ جیسی پُر افتخار ڈگری تفویض کی گئی۔

عام تجربہ ہے کہ سیاست داں جب کسی بڑے آئینی عہدے پر فائز ہوتے ہیں تو اس عہدے کے وقار کا اسیر ہو کر وہ مصلحت اندیشی سے کام لینے لگتے ہیں، اُن کی گفتار و کردار عہدے کی اسیر بن جاتی ہے لیکن فرزند بھوپال عزیز قریشی نے جب تک گورنر کا عہدہ سنبھالا اس کے جوہر کھلتے ہی رہے۔ انھوں نے اترپردیش کے گورنر کی حیثیت سے مشرقی علوم کی مولانا محمد علی جوہر یونیورسٹی، رامپور کے برسوں سے بستۂ خاموشی میں پڑے قانون کو منظوری دے کر جو والہانہ کارنامہ انجام دیا، وہ تو سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ عزیز قریشی کے ایسے ہی کاموں اور کارناموں پر یہ شعر یاد آتا ہے

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں

عارف عزیز
20-کمالی برج بھونیا، ا، گیا بھوپال-462001
E-mail:arifazizbpl@rediffmail.com
Mob. No. 9425673760

ساہتیہ اکیڈمی نے 24 ہندستانی زبانوں کے لیے ترجمہ ایوارڈ 2023 کا اعلان کیا

اردو میں 'پوسٹ باکس نمبر 203، نالا سوپارا' کے لیے احسن ایوبی کو ترجمہ ایوارڈ

نئی دہلی (12 مارچ)۔ ساہتیہ اکیڈمی کے صدر مادھو کوشک کی صدارت میں منعقد ساہتیہ اکیڈمی ایگزیکٹو بورڈ کے اجلاس میں 24 ہندستانی زبانوں میں ساہتیہ اکیڈمی ترجمہ ایوارڈ 2023 کے لیے انعامات کی منظوری دی گئی ہے۔ اردو میں یہ ایوارڈ چترا مدگل کے ہندی ناول پوسٹ باکس نمبر 203 نالا سوپارا کے اردو ترجمے کے لیے احسن ایوبی کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ دیگر انعام یافتگان میں کشمیری کے لیے گلزار احمد راتھر، ہندی کے لیے ریتا رانی پالیوال کو اور انگریزی کے لیے نوتیجا ریوسین کا انتخاب کیا گیا۔ ساہتیہ اکیڈمی ترجمہ ایوارڈ کے لیے اس بار یکم جنوری 2017 سے 31 دسمبر 2021 کے درمیان پہلی بار شائع ہونے والے تراجم زیر غور آئے۔ یہ ایوارڈ امتیازی نشان اور پچاس ہزار روپے پر مشتمل ہے جو آئندہ ایک پروقار تقریب میں پیش کیے جائیں گے۔ واضح رہے کہ احسن ایوبی اردو کے ایک بہترین مترجم اور نقاد ہیں۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی اور فی الحال وہ شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

رام پور رضا لائبریری میں نئے ڈائرکٹر کی تقرری پر ناراضگی

نئی دہلی (16 مارچ)۔ جنوبی ایشیا کی اہم لائبریریوں میں سے ایک رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر کے طور پر ڈاکٹر پشکر مشرا کی تقرری پر محبان علم و ادب میں سخت ناراضگی پائی جاتی ہے۔ کئی لوگوں نے نامہ نگار 'انقلاب' سے رابطہ کرکے بتایا کہ نئے ڈائرکٹر ہندی، اردو، سنسکرت زبان و ادب یا مشرقی علوم سے نابلد ہیں، چہ جائیکہ فارسی، عربی علوم اور مخطوطہ شناسی کی بات کی جائے۔ مشرقی علوم اور زبان و ادب کے عظیم مرکز کے طور پر مشہور رام پور رضا لائبریری میں علوم و زبان سے نابلد ڈائرکٹر کی تقرری کو کئی لوگوں نے علم و ادب کا مذاق قرار دیا۔ تقرری نوٹیفکیشن میں کہا گیا کہ کابینہ کمیٹی نے ڈاکٹر پشکر مشرا کی تقرری ڈائرکٹر رام پور رضا لائبریری کے طور پر تین سال کے لیے کی ہے۔ اس سلسلے میں ضروری کمیونی کیشن وزارت کو بھیج دیا گیا۔

اس پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ رضا لائبریری ایشیا میں مشرقی علوم اور نادر و نایاب مخطوطات کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں ڈائرکٹر کے عہدے پر اب تک مولانا امتیاز علی خاں عرشی، عابد رضا بیدار اور ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی جیسے علم و فن کے ماہرین رہ چکے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف مشرقی علوم کے ماہرین تھے بلکہ لائبریری سائنس سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اب ایک مشرقی علوم سے بے بہرہ شخص کو اس عظیم مرکز کا ڈائرکٹر بنا کر گویا ہندستانی گیان پرمپرا کا مذاق اڑایا گیا۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ملک میں اردو، عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کے ماہرین کا کال پڑ گیا جب کہ ایسا ہرگز نہیں۔ آج بھی ملک میں مشرقی علوم کے ماہرین کی کوئی کمی نہیں۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ رضا لائبریری میں ایسے ڈائرکٹر کی تقرری کی جائے جو اس کا اہل ہو۔ خیال رہے کہ رضا لائبریری کا شمار ہند-اسلامی علوم اور فنون کے ایک بیش بہا مرکز کے طور پر بھی ہوتا ہے۔ اس لائبریری کی بنیاد نواب فیض اللہ خاں نے 1774 میں رکھی تھی۔ رام پور کے نواب علم و ادب کے بڑے دلدادہ تھے اور علمائے کرام، شاعر، مصور، خطاط اور موسیقار ان کی سرپرستی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہندستان کی آزادی اور ریاست کے انضمام کے بعد لائبریری کو ٹرسٹ کے زیر انتظام لایا گیا جو 6 اپریل 1951 کو بنایا گیا تھا۔ سابق مرکزی وزیر تعلیم پروفیسر سید نورالحسن نے اس لائبریری کو یکم جولائی 1975 کو پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت قانونی تحفظ فراہم کیا۔ اس لائبریری میں عربی، فارسی، پشتو، سنسکرت، اردو، ہندی اور ترکی زبانوں میں 17 ہزار مخطوطات ہیں۔ مختلف ہندستانی اور غیر ملکی زبانوں میں تقریباً 60 ہزار مطبوعہ کتابوں کا مجموعہ بھی دستیاب ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو دُنیا

غازی آباد نگر نگم اردو زبان میں خبریں بھیجنے سے قاصر

کچھ اخباری نمائندوں کے مطالبے کے باوجود نگر نگم نے توجہ نہیں دی

غازی آباد (24 مارچ)۔ غازی آباد نگر نگم اپنے شعبوں اور محکموں کی سرگرمیوں سے میڈیا کو آگاہ کرنے کے لیے سوشل میڈیا اور اخباری نمائندوں کو ہندی میں پریس نوٹ ارسال کرتی ہے۔ یہ اس کے معمول میں شامل ہے۔ ذرائع ابلاغ کو ارسال کیے جانے والے اس مواد میں نگر کمشنر و دیگر متعلقہ عہدیداروں کے بیانات، شہر کی میئر سنیتا دیال اور نگم کی انتظامی سرگرمیوں اور کارروائیوں کو ریلیز کیا جاتا ہے لیکن یہ عام طور سے صرف ہندی زبان میں ریلیز کیا جاتا ہے کیوں کہ نگر نگم میں پریس نوٹ کو اردو زبان میں ترجمہ کرنے یا اس طرح کی خبروں کو اردو میں بھیجنے کے لیے اس کے پاس اردو جاننے والا کوئی اہلکار نہیں ہے جو نگم کی مذکورہ سرگرمیوں کو اردو میں ترجمہ کر سکے جب کہ اردو اخبارات کے کچھ نمائندے اردو میں بھی پریس ریلیز جاری کرنے کا مطالبہ اور شکایت کرتے رہے ہیں۔ نگم کی میڈیا سیل سے وابستہ [illegible] نے ایک سوال کے جواب میں [illegible] سے کہا کہ پریس نوٹ اور نگم کی سرگرمیوں کو اردو زبان میں بھیجنے کے لیے کوئی اردو داں نہیں ہے اس لیے وہ اردو میں خبر اور اخباری نمائندوں کو اردو زبان میں خبریں ارسال کرنے سے قاصر ہیں۔

(انقلاب۔ دہلی)

سرکاری دفاتر اور آر ٹی سی میں اردو کا استعمال کیا جائے

حیدرآباد (6 مارچ)۔ صدر تلنگانہ اردو اکیڈمی طاہر بن حمدان نے کہا کہ اردو اکیڈمی ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کے طور پر نافذ کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائے گی۔ انھوں نے کہا کہ تمام محکموں کے عہدیداروں کو اردو کے دوسری سرکاری زبان کے طور پر نفاذ کی ہدایت دی جائے گی۔ تلنگانہ سرکاری زبان ترمیمی قانون 2017 مورخہ 23 دسمبر 2017 قانون کو نافذ 27 اپریل 2018 سے ہوا ہے۔ تمام ضلع کلکٹروں اور تعلیمی بورڈ کے ضلعی عہدیداروں کو طاہر بن حمدان نے مکتوب روانہ کرتے ہوئے تمام سرکاری دفاتر اور اداروں میں اردو زبان کے استعمال کا مشورہ دیا ہے۔ تلنگانہ میں [illegible] اسکولوں کے مماثل اردو میڈیم [illegible] اسکول قائم کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو لسانی اقلیت تلنگانہ میں بڑی تعداد میں ہے اور ان کی سہولت کے لیے سرکاری دفاتر، عدالتوں اور کالجوں کے سائن بورڈز پر اردو شامل کی جائے۔ انھوں نے منیجنگ ڈائرکٹر آر ٹی سی کو ایک علاحدہ مکتوب روانہ کرتے ہوئے آر ٹی سی کی تمام بسوں پر اردو تحریر شامل کرنے کا مشورہ دیا۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو اساتذہ کے مسائل کے حل کے لیے
کابینی سب کمیٹی سے نمائندگی

سنگاریڈی (16 مارچ)۔ محمد خواجہ مجتبیٰ الدین ریاستی معاون صدر اور ریاض احمد خان ریاستی جنرل سکریٹری اسٹیٹ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن (سوٹا) نے حکومت تلنگانہ کی جانب سے اساتذہ و ملازمین سرکار کے دیرینہ مسائل کے حل کے لیے تشکیل شدہ کابینی سب کمیٹی کے چیئرمین ریاستی وزیر صحت و مالیات ہریش راؤ سے ملاقات کرتے ہوئے نمائندگی کی۔ کابینہ سب کمیٹی نے سکریٹریٹ کے گراؤنڈ فلور پر ریاست کی مختلف اساتذہ تنظیموں سے تبادلۂ خیال کیا اور تجاویز حاصل کیں۔ اس موقع پر اردو اساتذہ کی تنظیم اسٹیٹ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن (سوٹا) کے ریاستی ایسوسی ایٹ صدر محمد خواجہ مجتبیٰ الدین اور ریاستی جنرل سکریٹری محمد ریاض احمد خان نے نمائندگی کرتے ہوئے کابینہ سب کمیٹی کو چند اہم تجاویز پیش کیں جن میں انھوں نے کہا کہ جی او 317 کے اطلاق کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان اردو اساتذہ کا ہوا ہے۔ چوں کہ اضلاع میں اردو اسکولوں کی تعداد کم ہے لہٰذا اسکولوں کی عدم موجودگی کو بہانہ بناتے ہوئے اردو اساتذہ کو دور دراز مقامات اور دیگر اضلاع میں تعینات کیا گیا ہے۔ انھوں نے کابینہ سب کمیٹی کو بتایا کہ سابق میں کانگریس حکومت نے اساتذہ اور ملازمین کو جی او 610 کے تحت اپنے اپنے ضلع کو واپس کیا تھا اسی طرح موجودہ حکومت بھی اساتذہ کو ان کے اپنے مطلوبہ ضلع یا آبائی ضلع میں متعین کر سکتی ہے۔ انھوں نے اسکول اسسٹنٹ اور سیکنڈری گریڈ ٹیچروں کی زائد پوسٹ بنانے اور اس کے لیے قدیم متحدہ ضلع کو زون بناتے ہوئے اس دیرینہ مسئلے کو بڑی آسانی سے حل کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس موقع پر ریاستی وزرا [illegible] اور سبیتا اندرا ریڈی نے ان تجاویز و مطالبات کو توجہ کے ساتھ سماعت کی اور جی او 317 کے متاثرہ اساتذہ کے ساتھ انصاف کرنے کا یقین دلایا۔ اس موقع پر کمشنر اسکول ایجوکیشن دیوسینا، پی آر سی کمیٹی چیئرمین شیو شنکر، دونے کرشنا ریڈی (آئی اے ایس) اور دیگر عہدیداران موجود تھے۔ (سیاست۔ حیدرآباد)

غیر تربیت یافتہ اساتذہ کے معاملے میں فیصلے سے اردو اساتذہ میں اضطراب

محمد رفیع

مظفرپور (22 مارچ)۔ غیر تربیت یافتہ اساتذہ کے موضوع پر سماعت کرتے ہوئے پٹنہ ہائی کورٹ نے جو فیصلہ دیا ہے اس سے سال 2016 میں اسپیشل اردو ٹی ای ٹی سے بحال ہوئے اساتذہ میں اضطراب ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے قومی اساتذہ تنظیم بہار کے ریاستی کنوینر و آزاد صحافی محمد رفیع نے قومی، ملی و سیاسی رہنماؤں سے توجہ دینے کی اپیل کی ہے۔ انھوں نے وضاحت کیا کہ سال 2016 میں اردو اساتذہ کی خصوصی بحالی ہوئی تھی، اس لیے وہ ہمیشہ نشانے پر ہیں۔ کبھی انھیں ٹرینڈ نہیں تسلیم کیا جاتا ہے تو کبھی اس بحالی کو ہی غلط قرار دے دیا جاتا ہے جب کہ سال 2013 کے نوٹیفکیشن کے تحت یہ بحالی ہوئی ہے اور عدالت عظمیٰ کے حکم سے ہی بحالی ہوئی تھی۔ جناب رفیع نے کہا کہ اس سلسلے میں ہمارے رہنماؤں کی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

(قومی تنظیم۔ پٹنہ)

اردو میڈیم کی 68% اسامیاں روسٹر سسٹم کی نذر ہونے کا خطرہ

خصوصی اردو ڈی ایس سی کا انعقاد ضروری، چیف منسٹر سے نمائندگی پر زور

سنگاریڈی (20 مارچ)۔ تلنگانہ میں اردو دوسری سرکاری زبان ہے لیکن اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے گزشتہ دس برسوں میں حکومت کی جانب سے مناسب اقدام نہیں کیے گئے۔ اردو زبان کی بقا اور اس کی ترقی و ترویج میں سرکاری اردو میڈیم کا کلیدی رول ہے تاہم تلنگانہ میں اردو اسکولوں کے مسائل پر توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ تلنگانہ میں سیکڑوں اردو اسکول ہیں، جہاں ہزاروں طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اردو اسکولوں میں سب سے بڑا مسئلہ اردو اساتذہ کے تقرر کا ہے۔ جب بھی ڈی ایس سی نوٹیفکیشن جاری ہوتا ہے تو اس میں اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کی صحیح تعداد شامل نہ کرنے کی شکایت عام ہے اور جو کچھ بھی اسامیاں نوٹیفائی کی جاتی ہیں ان میں زیادہ تر اسامیاں روسٹر سسٹم کی نذر ہو جاتی ہیں۔ اردو میڈیم اسامیوں کو روسٹر سسٹم کے تحت بی سی، ایس سی، ایس ٹی طبقات کو مختص کی جاتی ہے جن میں اردو امیدوار دستیاب ہی نہیں ہوتے اور یہ اسامیاں خالی رہ جاتی ہیں جس کی وجہ سے ایک جانب طلبہ کی تعلیم متاثر ہوتی ہے تو دوسری جانب اردو اور اردو ٹیچرس سے ناانصافی ہوتی ہے۔ قانون کے مطابق ڈی ایس سی کے بعد روسٹر سسٹم کے تحت مختص اسامیوں کو جنرل زمرے میں تبدیل کرتے ہوئے اس کو اہل اردو امیدواروں سے پر کیا جاتا ہے۔ 2010 تک حکومت نے ایسا کیا بھی ہے لیکن تشکیل تلنگانہ کے بعد اردو اسامیوں کو ڈی ریزرو کا عمل نہیں ہوا جس کی وجہ سے اردو اسامیاں خالی ہیں۔ تشکیل تلنگانہ کے بعد بی آر ایس دور اقتدار میں اس وقت کے چیف منسٹر کے سی آر نے اسمبلی کو گواہ بنا کر اردو اساتذہ کی اسامیوں کو پر کرنے کے لیے خصوصی اردو میڈیم ڈی ایس سی منعقد کروانے کا اعلان کیا لیکن انھوں نے اسمبلی میں کیے گئے اپنے اعلان کو فراموش کر دیا اور خصوصی اردو ڈی ایس سی منعقد نہیں ہوا اور اردو اسکولوں کے مسائل جوں کے توں برقرار رہے۔ سال 2017 میں ڈی ایس سی منعقد ہوا جس میں 636 اردو ایس جی ٹی کی اسامیاں نوٹیفائی کی گئیں لیکن بھرتی صرف 301 پر ہوئی۔ ڈی ایس سی 2017 میں ایس جی ٹی، ایس اے اور دیگر کے بشمول جملہ 535 اردو اسامیاں روسٹر کی وجہ سے آج تک خالی ہیں۔ اردو اسامیوں کو ڈی ریزرو کرنے کے لیے اردو ٹیچرس، انصاف اور اردو تنظیموں نے احتجاج کیا۔ وفد وزیر و ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن پر دھرنا اور نمائندگیاں کیں لیکن بی آر ایس حکومت نے اس مسئلے پر سرد مہری سے کام لیا اور اردو اسامیوں کو ڈی ریزرو کرنے کا مسئلہ آج بھی جوں کا توں ہے۔ کانگریس حکومت نے ڈی ایس سی 2024 میں جملہ 11 ہزار 602 اسامیوں کے ساتھ منعقد کرنے کا اعلان کیا اور اعلامیہ بھی جاری کر دیا ہے جس میں اردو میڈیم کے لیے 1181 پوسٹ مختص کیے گئے۔ ان میں ایس جی ٹی کی 878، ایس اے اردو کی 32، ایس اے ریاضی کی 28، ایس اے بائیولوجیکل سائنس کی 38، ایس اے فزیکل سائنس کی 21، ایس اے سوشل کی 95، ایل پی اردو کی 74، پی ای ٹی اردو کی 34، ایس جی ٹی پی ای ٹی اردو کی 15 اور ایس اے پی ای ٹی اردو کی پانچ اسامیاں شامل ہیں۔ ڈی ایس سی 2024 میں اردو میڈیم کے لیے 1181 اسامیاں مختص کی گئیں لیکن اس میں سے صرف 450 اسامیوں پر تقرری کا امکان ہے جب کہ باقی 731 اسامیاں روسٹر سسٹم کے باعث خالی رہ جائیں گی یعنی 1181 اردو اسامیوں میں سے محض 32 فیصد اسامیوں پر تقررات ہوں گے اور 68 فیصد خالی رہ جائیں گی۔ گزشتہ دس سال سے بی آر ایس کی حکومت تھی جس میں اردو اسامیوں کو ڈی ریزرو کرنے پر توجہ نہیں دی گئی لیکن اب چوں کہ کانگریس حکومت اقتدار پر فائز ہے اور عوامی مسائل کی یکسوئی کا دعویٰ کیا جا رہا ہے چناں چہ اردو داں طبقہ اور بااثر مسلم قائدین چیف منسٹر اے ریونت ریڈی سے اس مسئلے کو رجوع کرتے ہوئے اردو میڈیم اسامیوں کو ڈی ریزرو کروانے کی ضرورت ہے۔ اردو تنظیمیں بھی ریاست بھر میں اس مسئلے پر اپنے علاقے کے ایم ایل اے اور وزرا سے نمائندگی کرتے ہوئے حکومت کی توجہ مبذول کروائیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ریاست میں مزید 7 ہزار 8 سو اردو اساتذہ کی اسامیاں خالی ہیں جنھیں نوٹیفائی کرتے ہوئے حکومت 1266 روسٹر اردو اسامیوں کو ان نئی اسامیوں کے ساتھ ملا کر کم از کم دو ہزار اسامیوں کا خصوصی اردو میڈیم ڈی ایس سی بغیر روسٹر سسٹم کے منعقد کرتے ہوئے اردو داں طبقے کے دیرینہ مطالبے کی تکمیل کرے۔ انصاف کا بھی یہی تقاضا ہے۔ (سیاست، حیدرآباد)

بی سی آئی ویلفیئر سوسائٹی کا حاجت مند قلم کاروں کی امداد کا اعلان

نئی دہلی (پریس ریلیز)۔ حاجت مند اور مفلوک الحال مصنفوں، صحافیوں اور فن کاروں یا ان کی رحلت کے بعد ان کے تنگ دست ورثا کی تھوڑی بہت مالی امداد کے لیے ایک عرصے سے دلی میں بی سی آئی ویلفیئر سوسائٹی قائم ہے۔ قارئین کرام میں سے اگر کوئی صاحب زمرۂ استحقاق میں آتے ہوں تو وہ امداد کے لیے مذکورہ انجمن سے رجوع فرما سکتے ہیں یا اگر آپ کے علم میں ان طبقات میں سے کوئی صاحب ضرورت مند ہوں تو آپ انھیں مطلع فرمائیں۔ درخواست میں مالی حالت، موجودہ ذرائع آمدنی، تعلیم، تجربہ، عمر اور صحت کی کیفیت کا ذکر مناسب ہوگا۔ درخواست پر اپنے جوار کے دو معتبر حضرات کے دستخط (نام اور پتا، حیثیت عرفی کے ساتھ) کرالیجیے۔ سوسائٹی موصولہ درخواستوں کا جائزہ لے گی اور ثبوت احتیاج کو زیر نظر رکھ کر فیصلہ کرے گی۔ وسائل کی کمی کی بنا پر سوسائٹی کے لیے مراسلت کا جواب دینا ممکن نہ ہوگا۔ سوسائٹی ایک ہزار روپے ماہوار کی حد تک عارضی اور علاماتی امداد کرتی ہے۔ درخواست صدر انجمن کے نام مندرجہ ذیل پتے پر بھیجنے کی زحمت کیجیے:

سید تمر حامد
صدر بی سی آئی ویلفیئر سوسائٹی،
تعلیم آباد، سنگم بہار، نئی دہلی-110080

طلبہ کی ذہنی و فکری تعمیر ہی استاد کا اولین فریضہ ہے اور طلبہ کی کامیابی استاد کی کامیابی ہے: پروفیسر آفتاب احمد آفاقی

بنارس (پریس ریلیز، 9 مارچ)۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کا تصور استاد اور شاگرد کے بغیر ممکن نہیں۔ ادارے کو شناخت اور کامیابی عطا کرنے میں استاد اور شاگرد دونوں کا یکساں حصہ ہوتا ہے۔ طالب علم اچھا اور کامیاب اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ استاد کے بتائے ہوئے راستوں پر چلے اور استاد کی کامیابی طلبہ کی کامیابی میں مضمر ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے شعبۂ اردو کی ادبی تنظیم دھنک ادبی فورم کے زیر اہتمام طلبہ و ریسرچ اسکالر سیمینار میں اپنے صدارتی تقریر کے دوران کیا۔

دھنک ادبی فورم کے نگراں ڈاکٹر مشرف علی نے تنظیم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دھنک ادبی فورم شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کی ادبی تنظیم ہے جس کے تحت طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کے مختلف ادبی اور ثقافتی تقریبات منعقد کیے جاتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ ۷ پر)

رفتید ولے نہ از دل ما

ظفر آغا

نئی دہلی۔ اردو انگریزی کے بزرگ صحافی اور قومی آواز کے چیف ایڈیٹر ظفر آغا کا 22 مارچ 2024 کو دہلی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 70 برس تھی اور وہ ضعیفی اور سینے کے انفیکشن کے مرض میں مبتلا تھے۔ جناب ظفر آغا کو پہلے دہلی کے ایمس میں داخل کرایا گیا تھا بعد میں ایک پرائیویٹ اسپتال کے آئی سی یو میں داخل کرایا گیا۔ ان کی نماز جنازہ درگاہ شاہ مرداں میں ادا کی گئی جب کہ تدفین جوش ملیح آبادی قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں صحافت اور مختلف شعبہ ہائے حیات کے سرکردہ لوگوں نے شرکت کی۔ خاندانی ذرائع کے مطابق پس ماندگان میں ایک بیٹا ہے، اہلیہ ثمینہ رضوی کا انتقال کورونا کے دوران ہو گیا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی اور معروف صحافی اور تجزیہ نگار قمر آغا ہیں جو کئی نیوز چینل میں ایکسپرٹ کے طور پر آتے ہیں۔ وہ الہ آباد کے رانی منڈی کے رہنے والے تھے۔ اسکولی تعلیم بوائز ہائی اسکول سے ہوئی اور اعلیٰ تعلیم الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی تھی جہاں سے انھوں نے پوسٹ گریجویٹ کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے روزگار کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز انگریزی روزنامہ 'پیٹریاٹ' سے کیا تھا لیکن ان کو شہرت 'دی انڈیا ٹوڈے' سے ملی جو اس وقت صحافت کا آئینہ ہوا کرتا تھا اور ان کی رپورٹ سے حکومت ہل جاتی تھی۔ ان کے کالم اردو اور انگریزی کے علاوہ مختلف زبانوں میں شائع ہوتے تھے۔

پروفیسر عبدالوحید نظامی

آکولہ (18 مارچ)۔ ودربھ کی مشہور و معروف شخصیت، ادیب، نقاد پروفیسر عبدالوحید نظامی کا مختصر علالت کے بعد 16 مارچ 2024 کو انتقال ہو گیا۔ موصوف کی عمر انتقال کے وقت 52 برس تھی۔ پروفیسر عبدالوحید نظامی ولد عبدالحفیظ نظامی کی نماز جنازہ 17 مارچ کو امراوتی کی مسجد میں ادا کی گئی اور دوپہر بارہ بجے کے قریب امراوتی کے مقامی گنگری قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے جنازے میں آکولہ، امراوتی ضلع اور اطراف کے شہروں سے ہزاروں کی تعداد میں ان کے چاہنے والے اساتذہ، شاگرد اور سماجی شخصیات نے شرکت کی۔

مرحوم عبدالحفیظ نظامی کے یہاں یکم جولائی 1972 کو پروفیسر عبدالوحید نظامی کا تعلق مرتضیٰ پور، ضلع آکولہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی اس کے بعد بی اے کی تعلیم جی ایس کالج کھام گاؤں ضلع بلڈانہ سے مکمل کی۔ اس کے بعد ایم اے (اردو، فارسی، سماجیات اور تاریخ)، بی ایڈ ناگپور یونیورسٹی سے مکمل کیا۔ اردو میں مذہبی ادب: مطالعہ اور جائزہ کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے مختلف مقامات پر بطور لیکچرر ملازمت کی اس کے بعد مستقل طور پر مہاراشٹر ودیالیہ آرٹس کالج مرتضیٰ پور ضلع آکولہ میں بطور لیکچرر ان کی تقرری ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالوحید نظامی کو سنت گاڈگے بابا امراوتی یونیورسٹی میں اردو کے پہلے پروفیسر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ وہ اس وقت پروفیسر و صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اپنی خدمات آرٹس کالج مرتضیٰ پور، ضلع آکولہ میں انجام دے رہے تھے۔ جہاں تک ادبی خدمات کا تعلق ہے، آپ گزشتہ کئی سالوں سے تحقیقی، تعلیمی اور ادبی مضامین لکھ رہے تھے جو ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی اب تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جس میں ایک کتاب 'ڈاکٹر محبوب راہی کی شعر نگاری' (منتخب نظامی تحریریں) شامل ہیں۔

ادارہ ہماری زبان مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : اُردو شاعری میں شخصی مرثیے
مصنف : پروفیسر آفاق حسین صدیقی
ضخامت : 240 صفحات
قیمت : 350 روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی-110002
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر
E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

اُردو میں صنف مرثیہ عربی و فارسی شاعری کے زیر اثر داخل ہوئی۔ واقعات کربلا کے منظوم بیانات کو صنف مرثیہ میں فوقیت حاصل ہے۔ اس اعتبار سے بعض لوگ صرف مرثیوں کو کربلا میں رونما ہونے والے واقعات کا ادب تسلیم کرتے ہیں۔ ہندستان میں مرثیہ گوئی کو دکن میں فروغ ملا۔ دکن کے بادشاہوں اور صوفیوں نے مرثیہ گوئی کے میدان میں کار ہائے نمایاں انجام دیے۔ میراں جی شمس العشاق کی وفات پر برہان الدین جانم کا طویل شخصی مرثیہ اس کی عمدہ مثال ہے۔ البتہ شمالی ہند میں مرثیہ کو لکھنؤ اور دہلی میں خوب فروغ ملا۔ لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کو بام عروج عطا کرنے والوں میں میر انیس اور مرزا دبیر کا نام ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'اُردو میں شخصی مرثیے' میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے اُردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت اور عروج کو قارئین و ناقدین کے سامنے پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب کو 6 ابواب میں تقسیم کیا۔ پہلے باب میں مرثیہ کیا ہے، مرثیے کی تعریف، مرثیے کی قسمیں، اُردو مرثیے کی روایت، یونانی، لاطینی، انگریزی، عربی، فارسی اور اُردو شاعری میں مرثیہ اور اُردو شاعری میں شخصی مرثیہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ دوسرے باب میں اُردو شاعری میں شخصی مراثی (عہد قدیم اور متوسطین کے دور میں دکنی اور دلی کی شاعری میں شخصی مرثیہ کا جائزہ) شمالی ہند کے متوسطین کے دور میں کہے گئے شخصی مرثیوں پر تحقیقی نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ تیسرے باب میں اُردو شاعری کے دور جدید میں شخصی مرثیہ گوئی (مولانا حالی، شبلی نعمانی، چکبست، سرور جہاں آبادی، مولانا سید سلیمان ندوی، تلوک چند محروم اور علامہ اقبال کے شخصی مرثیوں کا جائزہ) کا تنقیدی و تحقیقی محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں آزادی سے پہلے کہے گئے اُردو شاعری میں شخصی مرثیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں آزادی کے بعد اُردو شاعری میں شخصی مرثیے (آزادی کے بعد رہنماؤں کی موت پر کہے گئے شخصی مرثیے، آزادی کے بعد عزیزوں، رفیقوں، دوستوں وغیرہ پر کہے گئے شخصی مرثیے، جاں نثار اختر کے شخصی مرثیے، پروفیسر نثار شمیم کے شخصی مرثیے) کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چھٹا باب ماحصل 'اُردو شاعری میں شخصی مرثیے' عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ دراصل یہ باب مذکورہ پانچوں ابواب کی تفہیم و تجزیہ پر مشتمل ہے۔

پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے زیر تبصرہ کتاب میں صنف مرثیہ اور قصیدہ کے درمیان فرق پر تحقیقی گفتگو کرتے ہوئے لکھا کہ بعض ناقدین نے قصیدہ اور مرثیہ کو اصل میں ایک ہی سکے کے دو پہلو قرار دیا کہ مرثیہ میں مرنے والے کے اوصاف، خصائل، محاسن اور اخلاق کا بیان درد ناک اور غم زدہ لہجے میں کیا جاتا ہے جب کہ قصیدہ میں زندہ شخص کی تعریف و توصیف، جاہ و جلال، دبدبہ اور شان و شوکت وغیرہ کا بیان مبالغہ آمیز انداز میں کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض ناقدین یہ بھول جاتے ہیں کہ مرثیے اور قصیدے کی صنف میں فرق ان کی مختلف ہیئت کی بنا پر ہے۔ یہاں تک کہ قصیدہ کی ہیئت مقرر ہے یعنی قصیدہ کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے اور دوسرے اشعار کے دوسرے مصرعے پہلے شعر کے مصرعوں کے ہم ردیف و ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ جب کہ مرثیہ میں ہیئت یا فارم کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس لیے مرثیے مسدس، مخمس، ترکیب بند اور ترجیع بند، غزل وغیرہ کی ہیئت میں لکھے گئے ہیں۔ مذکورہ بحث کی روشنی میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے مرثیوں کو تین حصوں (۱) مرثیہ (۲) شخصی مرثیہ اور (۳) شہر مرثیہ (شہر آشوب) میں تقسیم کرتے ہوئے ان کا تحقیقی و تنقیدی محاکمہ پیش کیا۔

پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے باب دوم 'اُردو شاعری میں شخصی مراثی عہد قدیم اور متوسطین کے دور میں' میں اُردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت پر ناقدانہ گفتگو کرتے ہوئے لکھا کہ اُردو ادب میں برہان الدین جانم پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے والد ماجد شاہ میراں جی شمس العشاق کی وفات کے بعد شخصی مرثیہ لکھا۔ اس کے بعد موصوف نے شمالی ہند کی شاعری میں شخصی مرثیے پر اپنا نقطہ واضح کرتے ہوئے لکھا کہ شمالی ہند میں مرزا غالب نے اپنے بھانجے زین العابدین عارف کی وفات پر جو مرثیہ لکھا وہ شمالی ہند کا پہلا شخصی مرثیہ ہے۔ اس کے بعد مومن خاں مومن نے اپنے محبوب کی وفات پر شخصی مرثیہ رقم کیا۔ غالب نے اپنی زندگی میں ہی:

رشک عرفی و فخر طالب مرد
اسد اللہ خاں غالب مرد

اپنی تاریخ وفات لکھی۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ اسے بنیاد بنا کر ان کا کوئی شاگرد ان کا مرثیہ لکھے۔ غالب کی وفات کے بعد الطاف حسین حالی، قربان علی سالک اور میر مہدی مجروح نے شخصی مرثیے رقم کیے۔ لیکن حالی نے غالب کی وفات کے بعد جو شخصی مرثیہ لکھا وہ سب سے بہتر و افضل تھا۔

پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے باب سوم میں اُردو شاعری کے دور جدید میں شخصی مرثیہ گوئی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس باب میں انھوں نے حالی تا اقبال شخصی مرثیہ گوئی کو اپنی تحقیق کا موضوع بناتے ہوئے ان کے مرثیوں کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب کے آغاز میں انھوں نے لکھا ہے کہ اُردو شاعری میں شخصی مرثیہ گوئی کے رواج کے فروغ کا اصل زمانہ غدر 1857 کے بعد شروع ہوا۔ جدید رجحانات و میلانات کے زیر اثر جہاں اُردو شاعری کی دوسری اصناف شاعری میں تقلید پرستی اور روایت پسندی سے انحراف برتتے ہوئے انھیں نئے اور عام موضوعات کے لیے استعمال کیا گیا وہیں صنف مرثیہ میں بھی واقعات کربلا سے الگ ہٹ کر شخصیات کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور متوفی کے محامد و فضائل بیان کیے گئے۔

بلاشبہ اُردو شخصی مرثیے کی روایت غدر کے بعد شروع ہوئی۔ اس زمانے میں جن سیاسی و سماجی، علمی و ادبی رہنماؤں نے جنگ آزادی اور ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا شعرا نے ان کی وفات کے بعد ان کے عادات و خصائل کی تعریف اپنے مرثیوں میں کی۔ حالی کا مرثیہ مرزا غالب اس کی عمدہ مثال ہے۔ اسی سلسلے میں شبلی نعمانی نے اپنے عزیز بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم وکیل ہائی کورٹ کا مرثیہ لکھا۔ شبلی نعمانی نے مرثیہ حالی اور مرثیہ سر سید لکھا۔ چکبست نے اپنے شعری مجموعے 'صبح وطن' میں نو مرثیے شامل کیے۔ انھوں نے بشن نرائن در، گوپال کرشن گوکھلے اور بال گنگا دھر تلک کی وفات پر شخصی مرثیے لکھے۔ سرور جہاں آبادی نے رام تیرتھ، نواب محسن الملک، داغ دہلوی، امیر مینائی اور محمد حسین آزاد کے شخصی مرثیے رقم کیے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی نعمانی، مولانا اشرف علی تھانوی اور اپنی بیٹی کی وفات پر شخصی مرثیے لکھے۔ تلوک چند محروم نے چکبست، سرور، منشی نادر علی خاں کاکوروی، درگا سہائے سرور، طالب اور دیر جہاں، دہلوی، ابو الکلام آزاد، سروجنی نائڈو اور لالہ لاجپت رائے کی وفات پر شخصی مرثیے لکھے۔ علامہ اقبال نے ملکہ وکٹوریہ، خواجہ حسن نظامی کے بیٹے، داغ دہلوی، والدہ مرحومہ اور سر راس مسعود کی وفات پر مرثیے لکھے ہیں۔ علامہ اقبال نے ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر جو مرثیہ لکھا اس کے دوسرے بند کا شعر ملاحظہ کیجیے

کہتے ہیں آج عید ہوئی ہے ہوا کرے
اس عید سے تو موت ہی آئے خدا کرے

کتاب کے چوتھے باب 'آزادی سے پہلے کہے گئے شخصی مرثیوں کا جائزہ' میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے تیسرے باب کی توسیع کی ہے۔ دراصل تیسرا باب علامہ اقبال کی وفات تک لکھے گئے شخصی مرثیوں پر مبنی ہے۔ چوتھا باب 1936 تا 15 اگست 1947 کے دورانیے میں لکھے گئے اہم شخصی مرثیوں پر مشتمل ہے۔ اس دوران غیر منقسم ہندستان میں وفات پانے والی اہم سیاسی، سماجی، علمی، ادبی، روحانی شخصیات پر لکھے گئے شخصی مرثیوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ موصوف نے موقر رسائل و جرائد یعنی ادیب، مخزن، علی گڑھ میگزین، ہمایوں، نیرنگ خیال، ساقی، معارف، برہان، سب رس، آجکل اور شاعر میں شائع ہونے والے شخصی مرثیوں پر بھی تنقیدی زاویہ پیش کیا ہے۔

کتاب کے پانچویں باب میں پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے 15 اگست 1947 کے بعد لکھے گئے شخصی مرثیوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے آزادی کے بعد ہندستان میں رہنماؤں کی ہونے والی وفیات اور بیرون ملک مشاہیر و قائدین کی وفیات، آزادی کے بعد شاعروں اور ادیبوں کی وفیات پر کہے گئے شخصی مرثیوں کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ ساتھ ہی موصوف نے جاں نثار اختر اور پروفیسر نثار شمیم کے شخصی مرثیوں پر تنقیدی نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ 'مہاتما گاندھی کے قتل پر لکھے گئے شخصی مرثیوں کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں کہ گاندھی جی کے قتل کے بعد ان پر لکھنے والے شعرا میں بہت سے شاعر ان کے نظریات سے اتفاق رکھتے تھے لیکن بعض ایسے شاعر بھی تھے جو ان کے سیاسی نظریات سے متفق نہ تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے گاندھی جی کی قومی خدمات، اور کردار و سیرت کو اپنے مرثیوں میں پیش کیا۔

بہر کیف پروفیسر آفاق حسین صدیقی نے زیر نظر کتاب میں صنف مرثیہ بالخصوص شخصی مرثیوں پر جس محنت شاقہ سے کام کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ انھوں نے اپنے حرف آغاز میں اس بات کا اعتراف صدق دل سے کیا کہ اس کتاب میں اُردو شاعری کے عہد قدیم سے دور حاضر کے اہم شخصی مرثیوں کا جائزہ لیا ہے۔ موصوف نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ عہد حاضر میں علم و ادب کساد بازاری کا شکار ہیں اور علمی و ادبی معاملات میں نئی نسل کی دلچسپیاں محدود ہوتی جا رہی ہیں۔ کتاب پر تقریظ ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے 'آفاق آفریں' عنوان سے رقم کی ہے۔ انتساب والد محترم حامد حسین مرحوم کے نام ہے۔ امید کرتا ہوں کہ رثائی ادب بالخصوص شخصی مرثیوں کے باب میں اس کتاب کو سنگ میل کا درجہ حاصل ہوگا۔

◆◆

بقیہ: علامہ شبلی کے نام معنون کتابیں

(صفحہ 8 سے آگے)

کے نام سے اس کا اردو میں ترجمہ کیا، جسے 1972 میں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے شائع کیا۔

ڈاکٹر زبید احمد کا یہ تحقیقی مقالہ علامہ شبلی کی یاد میں شائع کیا گیا ہے۔ خاص الفاظ یہ ہیں:

بیاد شمس العلماء محمد شبلی نعمانی

مزید کوئی تفصیل نہیں لکھی گئی ہے۔

4- شبلی شناسی کے رسائل

راقم کی یہ کتاب جس میں ہندو پاک کے ان رسائل و جرائد کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے، جنھوں نے علامہ شبلی کی یاد میں خصوصی نمبرات شائع کیے۔ اس میں کل دس رسائل و جرائد شامل ہیں جن کے نام یہ ہیں:

'فروغ اردو' لکھنؤ، 'صبا' حیدرآباد، 'المیزان' [illegible]، 'ادیب' علی گڑھ، 'کریسنٹ' لاہور، 'اردو ادب' دہلی، 'فارسی زبان' دہلی، 'فکر و نظر' علی گڑھ، 'شبلی کالج میگزین' اعظم گڑھ اور 'اسلام اور عصر جدید' دہلی۔

ناچیز نے اپنی اس کتاب کو شبلی صدی (نومبر 2014) کے موقع پر علامہ شبلی کو ایک خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا ہے۔

اب تک یہی چند کتابیں ہیں جو علامہ شبلی کے نام معنون کی گئی ہیں، دستیاب ہوئیں، البتہ کتابوں کی تلاش و جستجو میں ایک عاشق شبلی کا ایسا تفصیلی اور اہم [illegible] ہاتھ آیا جس کا انتساب علامہ شبلی کے نام کیا گیا ہے اور یہ التزام کیا گیا ہے کہ دارالتصنیف والترجمہ (بھوپال) سے شائع ہونے والی ہر کتاب پر اس انتساب کا ذکر ہوگا، چنانچہ راقم نے اس ادارے کی چند مطبوعات دیکھیں تو وہ انتساب ہر کتاب پر موجود پایا۔ علامہ شبلی کے اس عاشق صادق کا نام مولانا حبیب ریحان خان ندوی ہے، جو بھوپال کے ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ اور نامور عالم و مصنف تھے۔

انتساب

علامہ شبلی نعمانی کے نام

دارالتصنیف والترجمہ کا انتساب عہد آفریں تحریک کے روح رواں اور معمار شبلی، دارالمصنفین کے موسس، اردو کے لافانی ادیب، شاعر، علوم اسلامیہ کے محقق اور سیرت نگار رسول اعظم شبلی کے نام کرتے ہوئے مجھے فخر و مسرت ہے۔ شبلی کے نام اور کام کا حاصل علم و ادب کا ابر کرم بن کر میری اور بے شمار علما و ادبا کی تحریری خدمات کو سیراب کرتا رہا ہے۔

شبلی کے معترفین، مداحین اور خوشہ چینوں کی تعداد بے شمار ہے، شبلی استاذ الکل، عہد جدید کا معلم اول، عہد جدید و قدیم کا سنگم، مجسمہ علم و فن و پیکر خدمت دین و ملت، مصنف اور مصنف گر تھا۔

شبلی کی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے سامنے اور اپنے بعد علما و فضلا کی ایسی جماعت چھوڑی جو اس نئے زمانے میں اسلام کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ شبلی کے خوشہ چینوں کی یہ خوش قسمتی ہے کہ شبلی کے نام کی ایک ایک سطر موجود ہے اور اردو ادب کا جزو بنتی جارہی ہے۔ شبلی کے خیالات آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں اور قوم کے دل و دماغ پر ان کا سکہ جاری ہے۔ شبلی کی روحانیت پر اعتراض کرنے والے گروہ کا جواب سید سلیمان ندوی نے ایک جملے میں اس طرح دیا ہے کہ دریا کو کوزے میں سمو دیا ہے

'شبلی شبلی تھے، جنید و شبلی نہ تھے'۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
شائستہ منزل، 641، پورہ نظامی، عقب [illegible]،
اعظم گڑھ-276001، یوپی
E-mail: azmi408@gmail.com
Mob. 9838573645

طلبہ کی ذہنی و فکری تعمیر ہی اساتذہ کا اولین فریضہ ہے اور طلبہ کی کامیابی اساتذہ کی کامیابی ہے

(صفحہ 5 کا بقیہ)

اس کا مقصد طلبہ میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا کرنا اور ادب کی افہام و تفہیم کی صلاحیتوں کو صیقل کرنا ہے۔ انھی مقاصد کے حصول کے لیے 9 مارچ 2024 کو شعبۂ اردو کے سیمینار ہال میں طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کا سیمینار پروفیسر آفتاب احمد آفاقی کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں ایم۔ اے۔ سال اول کے دو، ایم اے سال آخر کے تین اور پی ایچ ڈی کے پانچ ریسرچ اسکالرز نے مقالے پیش کیے۔ ایم اے کے طلبہ سے کہا گیا تھا کہ وہ نصاب میں شامل کسی ایک نظم کا تجزیہ یا کسی ایک مضمون پر مقالہ اساتذہ کی نگرانی میں تحریر کریں اور ریسرچ اسکالرز اپنے موضوع سے متعلق مقالہ لکھیں اور پیش کرنے سے پہلے اپنے نگراں کے سامنے اس کی قرأت کر لیں۔ طلبہ اور ریسرچ اسکالرز نے اساتذہ سے رابطہ کیا اور مقالات کی اصلاح کے بعد انھوں نے سیمینار میں اپنے مقالے پیش کیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر محمد طاہر (صدر شعبۂ اردو، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ) نے مقالات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسی تقریبات سے طلبہ میں ادب کی تفہیم و تجزیہ اور مقالہ پیش کرنے کی تربیت ہوتی ہے اور یہاں پیش کیے گئے مقالات کسی بھی قومی سیمینار میں پیش کیے جانے والے مقالات سے کم نہیں تھے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ استاذ ڈاکٹر ارشاد نیازی مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ انھوں نے مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کے روشن مستقبل کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

اس سیمینار میں ایم اے سال اول کے محمد ساجد نے بعنوان 'تنقید کی اہمیت' اور ثمین نوشاد نے 'حالی کی تنقید نگاری کا جائزہ' کے موضوع پر اپنے مقالے پیش کیے۔ ایم اے سال آخر کے محمد شعیب نے 'کلام غالب کا اجمالی جائزہ'، صائمہ پروین نے 'جوش ملیح آبادی کی نظم البیلی صبح کا تنقیدی مطالعہ' اور ساجدہ بی بی نے 'اکبر الہ آبادی کی نظم تجارہ نامہ کا تجزیہ' کے عنوان سے اپنے مقالات پیش کیے۔ ریسرچ اسکالرز میں پرویز احمد (ساحر لدھیانوی: احساسات کا شاعر)، آصف جمال (مشتاق احمد یوسفی وارث علوی کی نظر میں)، محمد شاہنواز انصاری (قاضی عبدالستار بحیثیت تاریخی ناول نگار)، تسنیم قمر (اردو کی جدید مثنوی 1857 کے بعد)، مریم صبا (لالہ [illegible] لعل گروال اور رائے صاحب دیال گروال کی خدمات) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ ان مقالوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے شعبہ کے استاذ ڈاکٹر احسان حسن نے کہا کہ طلبہ کو اسی طرح محنت کرنی چاہیے، ہم اساتذہ ان کی اصلاح کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں۔ اگر یہی صورت حال رہی تو بہت جلد ہمارا شعبہ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کے شعبوں میں ممتاز مقام حاصل کرے گا۔

پروگرام کی نظامت شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر محمد صدام اور محمد اعظم نے کی۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر مشرف علی نے تمام مہمانان اور مقالہ نگاران کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر عبد السمیع اور ڈاکٹر رقیہ بانو کے علاوہ شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔

☆☆☆

علامہ شبلی کے نام معنون کتابیں

محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی اور ان کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر بعض اہل قلم نے اپنی تصنیفات کا انتساب ان کے نام کیا ہے۔ اس کا آغاز ان کے عہد میں ہوا اور بعد میں بھی چند کتابیں ان کے نام معنون کی گئیں۔ زیر نظر مضمون میں انہی کی تفصیلات قلم بند کی گئی ہیں۔

1- البرامکہ

'البرامکہ' مولوی محمد عبدالرزاق کانپوری (1862-1948) کی معرکہ آرا تصنیف ہے۔ اس نے بڑی شہرت و مقبولیت پائی۔ اس تصنیف کی وجہ سے اہل علم میں مصنف 'مولوی البرامکہ' کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ بیگم بھوپال سلطان جہاں بھی انھیں اسی نام سے یاد کرتی تھیں۔ اس کتاب کا انتساب مولوی عبدالرزاق نے علامہ شبلی کے نام کیا ہے۔

مولوی عبدالرزاق کانپوری علامہ شبلی کے خاص احباب میں تھے اور ان سے بے حد متاثر بھی۔ چنانچہ انھوں نے علامہ شبلی اور ان کے سلسلۂ نامورانِ اسلام سے متاثر ہو کر سلسلۂ نامورانِ اسلام کی تصنیفات کا آغاز کیا اور البرامکہ کے علاوہ 'نظام الملک طوسی' جیسی عمدہ کتابیں لکھیں۔

علامہ شبلی کے نام البرامکہ کے انتساب میں مصنف مرحوم نے درج ذیل عبارت سپرد قلم کی ہے:

"بکمال ادب و عقیدت بااظہار شکریہ تصنیف سلسلہ ہیروز آف اسلام یہ کتاب عالی جناب معلی القاب شمس العلما مولانا مولوی شبلی نعمانی پروفیسر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ و فیلو یونیورسٹی الہ آباد و علیم کے نام نامی و اسم گرامی سے منسوب کی جاتی ہے۔

مسند علم از وجودت شمع آداب باد
آستانت قبلہ جان اولی الالباب باد"

(البرامکہ، ص 2)

اس انتساب کے متعلق مولوی عبدالرزاق نے اپنی خودنوشت 'یادایام' میں سرسید احمد خاں کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب پہلی مرتبہ میری کتاب 'البرامکہ' شائع ہوئی تو میں نے ایک نسخہ (سرسید کی) نذر کیا۔ اس وقت سرسید بستر مرگ پر تھے۔ مولوی وحید الدین سلیم نے کتاب اور میرا عریضہ پیش کیا۔ کتاب ہاتھ میں لے کر چند صفحے پڑھے اور بہت خوش ہوئے اور فرمایا 'کتاب احتیاط سے رکھو میں ان شاء اللہ اس پر ریویو لکھوں گا'۔ لیکن جب تمہید کا صفحہ دیکھا تو فرمایا کہ مصنف نے بڑی غلطی کی ہے۔ اس کتاب کا تمہید مولوی شبلی کے نام کیا گیا۔ یہ تو میرا حق تھا۔ مولوی سلیم نے تائید کرتے ہوئے عرض کیا کہ بہ حیثیت ایک بزرگ قوم اور اردو کے معلم ثانی ہونے کی حیثیت سے ضرور یہ آپ کا حق تھا۔ (اردو کے معلم اول اسد اللہ خان غالب دہلوی تھے) یہ سن کر سرسید خفا ہوئے اور فرمایا کہ تم نے میرا منشا نہیں سمجھا۔ جب مولوی صاحب نے اصرار کیا تو ارشاد ہوا تم جانتے ہو کہ میں خاندان وزارت سے ہوں۔ میرے دادا دولت مغلیہ میں وزیر تھے اور البرامکہ ایک خاندان وزارت کی تاریخ ہے لہٰذا میرا حق انتساب شبلی سے بدرجہا فائق تھا۔"

(یادایام، ص 31-32)

'یادایام' اردو کی ایک نہایت عمدہ اور بڑی معلومات افزا خودنوشت ہے۔ اس پر راقم نے علامہ شبلی کے ذکر کے حوالے سے ایک مفصل مقالہ لکھا ہے، جو راقم کی کتاب 'شبلی خودنوشتوں میں' میں شامل ہے۔

2- تذکار سلف

نامور ادیب و شاعر پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (1894-1973) سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علامہ شبلی سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی کی تاریخی اور اخلاقی شاعری کا لاجواب تتبع کیا اور سب سے بڑے متبع قرار پائے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ بڑے نقادوں نے بھی ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔

علامہ شبلی سے متاثر ہونے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ 'تذکار سلف' علامہ شبلی کے نام معنون کیا ہے۔ اس سے ان کی شیفتگی شبلی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تمہید ان الفاظ میں ہے:

تمہید
میں کمال ادب سے
اپنے آنسوؤں کے ان چند کم مایہ قطروں کو جو ایک دردمند دل سے نکل کر اور قلم کی آنکھ سے بہ کر دامن قرطاس پر ٹپکے ہیں استاذ الہند غزالی عہد حضرت مولانا شبلی علیہ الرحمہ کی قبر پر (جن کے روحانی افادات کے آفتاب سے ذرۂ بے مقدار ضیاء کو کسب فیض کا شرف بخشا ہے) نچھاور کرتا ہوں۔

اس تمہید کے حرف حرف سے عقیدت شبلی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ شبلی کی شاعری کے تتبع کا آغاز پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے اس طرح کیا کہ وہ لسان العصر اکبر الہ آبادی (1846-1921) کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ 'بزم اکبر' کے مصنف قمر بدایونی (1891-1979) نے اکبر سے ان کا تعارف کرایا تو اکبر نے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ چنانچہ انھوں نے ایک نظم سنائی، جسے سن کر اکبر نے فرمایا:

"بالکل ہمارے شبلی کا سا رنگ ہے۔ کاش آپ اس کو کسی کارآمد مصرف میں استعمال کرتے۔" (تجلیات، ص 4)

اس واقعے کے بعد ضیاء احمد بدایونی نے علامہ شبلی کے سلسلۂ منظومات کو آگے بڑھایا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس واقعے کے بعد راقم کو علامہ شبلی کی تقلید میں تاریخ اسلام کے سبق آموز واقعات نظم کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ متعدد نظمیں، قطعہ یا مثنوی کی شکل میں تحریر کیں جو ملک کے مشہور رسائل میں شائع ہو کر خواص و عوام میں مقبول ہوئیں۔"

(تجلیات، ص 4-5)

ضیاء احمد بدایونی کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'تذکار سلف' 1928 میں علی گڑھ سے شائع ہوا ہے۔ اس کا پیش لفظ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مقدمہ مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے ہے۔

3- عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ

عربی ادبیات کے ماہر اور ممتاز عالم و محقق ڈاکٹر زبید احمد الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی میں استاد تھے۔ یہ کتاب ان کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے، جسے انھوں نے 1929 میں 'کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو عربک لٹریچر' کے عنوان سے لندن یونیورسٹی میں جمع کیا تھا۔ شاہد حسین رزاقی نے 'عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ' (بقیہ صفحہ ۔۔۔ پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر: اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر: عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ: جاوید پریس، 2096، روڈگران، لال کنواں، دہلی-۶
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212 Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت: فی شمارہ پانچ روپے، سالانہ 200 روپے
بیرونی ممالک: ۲۵ امریکی ڈالر
Subscription (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by Abdul Bari on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006. Editor: Dr Ather Farouqui